بحث ونظر:
خصوصی مضمون برائے ''الحق''

حضرت مولانا یحییٰ نعمانی
صدر المعہد العالی للدراسات الاسلامیہ لکھنؤ

# علت القتال کیا ہے؟ کفر؟ شوکت کفر؟ یا محاربہ؟

## جہاد کی آیات اور ان کے پس منظر کی روشنی میں

(۴) اس موقف کے حامل حضرات کثیر تعداد میں ان نصوص کو بھی پیش کرتے ہیں جن میں کفار یا مشرکین سے جنگ کرنے کا حکم آیا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان نصوص پر سرسری نظر ڈالی جائے تو یہ تأثر یقیناً قائم ہوتا ہے کہ سارے کفار و مشرکین سے جنگ کا حکم دیا جارہا ہے۔ مگر اگر قرآن مجید کے سیاق وسباق میں غور کیا جائے اور یہ اصول مدنظر رہے کہ قرآن مجید کی آیات جنگ کے حالات میں نازل ہوا کرتی تھیں جب کہ کفار و مشرکین کے مخصوص گروہوں یعنی مشرکین مکہ، دیگر عرب قبائل اور یہود مدینہ اور نصارائے شام وروم میں سے کسی کے خلاف جنگ قائم ہوتی تھی تو یہ سمجھ لینے میں دقت نہیں پیش آئے گی کہ ان نصوص کا مقصد لوگوں میں ان دشمنوں سے قتال کے لئے جوش وآمادگی پیدا کرنا ہوتا تھا۔

مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فوجوں کو روانہ کرتے تو جو ہدایات دیتے تو ان میں یہ بات بھی فرماتے:

اغزوا باسم الله قاتلوا من كفر بالله (صحيح مسلم، كتاب الجهاد، باب تامير الإمام الأمراء)

اللہ کے نام پر جنگ کو جاؤ، اللہ کا انکار کرنے والوں سے جنگ کرو۔ اب اگر اس کے صرف ظاہری الفاظ کو دیکھیں تو کفر علت قتال نظر آتا ہے، جو کسی کے نزدیک مراد نہیں ہے۔ یا جیسے قرآن میں کہا گیا: وقاتلوا المشركين كافة كما يقاتلونكم كافة (التوبة: ٣٦) تمام مشرکوں سے جنگ کرو جیسا کہ وہ سب کے سب تم سے جنگ کرتے ہیں۔

اس آیت میں تمام مشرکین سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا، مگر آگے اس کا سبب یہ بیان کیا گیا کہ ''وہ سب کے سب تم سے برسرپیکار و جنگ ہیں، اس لئے تم بھی ان سب سے جنگ کرو''۔ اس سبب کے بیان سے خود بخود مراد طے ہوگئی کہ اس آیت سے صرف مشرکین عرب مراد ہیں۔

(۵) مولانا مودودیؒ نے اس نقطۂ نظر کو کہ مسلمانوں کو بشرط مقدور غیر مسلم حکومتوں سے ہر حال میں جنگ کرنی

ہے، نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس کے دلائل مرتب کیے ہیں۔ مولانا اس کو مصلحانہ جنگ کا نام دیتے ہیں۔ موصوف نے ایک نہایت طولانی بحث کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعیت کا اصل مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، یہ امت اسی فریضہ کی انجام دہی کے لئے قائم کی گئی ہے۔ پھر مولانا فرماتے ہیں کہ امر بالمعروف تو طاقت کے زور سے انجام دیے جانے والا فریضہ نہیں ہے، وہ تو وعظ ونصیحت کے ذریعہ انجام دیا جائے گا۔ البتہ منکر کی مولانا نے دو قسمیں قرار دی ہیں، (۱) قلب وذہن کی اور خیال ورائے کی گندگی اور ناپاکی۔ اس کو دور کرنے کے لئے وعظ وتلقین کا حکم دیا گیا ہے۔ اور (۲) فعل وعمل کی برائی۔ مولانا کہتے ہیں کہ اسلامی شریعت نے اس کو بزور طاقت مٹانے کو مسلمانوں کا فریضہ قرار دیا ہے۔ اس کے لئے مولانا نے ان احادیث کا حوالہ دیا ہے جن میں منکر سے اگر قدرت ہو تو طاقت کے زور سے روکنے کا حکم آیا ہے "فلیغیرہ بیدہ" پھر مولانا فرماتے ہیں کہ ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ:

> اگر مسلمانوں میں اتنی قوت ہو کہ تمام دنیا کو منکر سے روک کر اسے قانون عدل کا مطیع بنادیں تو ان کا فرض ہے کہ اس قوت کو استعمال کریں اور جب تک اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا نہ دیں چین نہ لیں۔ (الجہاد فی الاسلام)

یقیناً احادیث میں اس کا حکم آیا ہے کہ ''تم میں سے جو کوئی برائی (منکر) دیکھے تو اس کو اگر قدرت ہو تو ہاتھ سے مٹادے، مگر باتفاق علماء یہ حکم مسلم امت کے داخلی دائرے کے اندر کا ہے۔ کسی نے اس کا مطلب یہ نہیں سمجھا ہے کہ جو غیر مسلم ان منکرات کو منکر ہی نہیں جانتا مثلاً شراب خوری، محرمات اکل وشرب، ہر مسلمان ان کو بھی بزور طاقت مٹانے کا (بشرط قدرت) ذمہ دار ہے۔ بلکہ یہاں بھی وہی اشکال سامنے آتا ہے کہ کوئی اس کا قائل نہیں کہ جہاد کے نتیجے میں ''منکر'' کا خاتمہ ہوجائے گا۔ بلکہ جہاد کے بعد اہل ایمان کو جب فتح نصیب ہوگی تو ''فعل وعمل کی برائی'' والا وہ منکر (جس کے خاتمے کو مولانا جہاد کا مقصد بتاتے ہیں) باقی رہے گا، اہل ذمہ شراب بنائیں گے، پییں گے، مردار کھائیں گے، حرام کام کریں گے اور عملی طور پر مشرکانہ اعمال ورسوم پر کاربند رہیں گے۔ جہاد اور اسلامی حکومت ان چیزوں کا خاتمہ نہیں کریں گے۔ یہیں سے مولانا کا استدلال بے محل ثابت ہوجاتا ہے۔

پھر مولانا نے ''قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ' والی آیت کے علاوہ کچھ اور آیات بھی پیش فرمائی ہیں جن کے بارے میں مولانا کا کہنا یہ ہے کہ ان میں ''بزور شمشیر'' جہاد کر کے ''فتنہ وفساد'' کو مٹانے کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر مجھے سخت حیرت ہے کہ اس مقام پر مولانا ایسی آیات بھی کیسے اور کیوں کر ذکر کر گئے ہیں جن کا موضوع جہاد وقتال سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً قرآن نے ذکر کیا ہے کہ بنی اسرائیل پر واضح کر دیا گیا تھا کہ جس نے کسی جان کو قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد مچایا ہو تو گویا اس نے سارے انسانوں کو قتل کر دیا۔ (من قتل نفسا

بغير نفس أو فساد فى الأرض فكأنما قتل الناس جميعا، المائدہ ۳۲) ایک جگہ قرآن نے منافقین کے بارے میں کہا کہ وہ پہلے بھی مسلمانوں میں افتراق وانتشار پیدا کرنا اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سے روگرداں کرنا چاہتے تھے، ان کے اس عمل کو قرآن نے ''فتنہ پروری'' سے تعبیر کیا اور کہا ''لقد ابتغووا الفتنة من قبل'' مولانا رحمۃ اللہ نے یہاں یہ دونوں آتیں بھی نقل فرمائی ہیں جو بے محل ہیں، یقیناً دونوں مقامات پر جن اعمال اور کرداروں کو فساد یا فتنہ کہا گیا ہے وہ خطرناک قسم کے منکر ہیں۔ مگر قرآن نے ان کے خلاف نہ جنگ کا حکم دیا ہے اور نہ ان کا استیصال جنگ کے ذریعہ ممکن ہے۔

## ایک عجیب بات:

آگے چل کر مولانا مرحوم نے ایک مرتبہ پھر تفصیل سے واضح کیا ہے کہ قرآن نے کن کن جرائم کو فساد قرار دیا ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ورنہ ہم مولانا کی یہ پوری بحث نقل کرتے تا کہ قارئین کو اندازہ ہوتا کہ مولانا کی اس تشریح نے ساری ہی برائیوں اور خرابیوں کو اپنے دائرہ میں لے لیا ہے۔ مولانا مرحوم کے یہاں اس منکر کا دائرہ کتنا وسیع ہے جس کے خلاف جنگ کا حکم دیا گیا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ "الإثم" (گناہ) کو بھی مولانا نے اس فساد کا مصداق قرار دیا ہے کہ جو کسی قوم میں اگر پایا جائے تو اس کے خلاف جنگ ضروری ہو جائے گی۔ اب اس پر کیا رائے زنی کی جائے؟؟

## فتنہ کی تشریح:

مولاناؒ کے اس موقف کی شاید اہم ترین بنیاد ''فتنہ'' کی وہ خاص تشریح ہے جو انہوں نے جنگ کی غایت اور انتہا بتانے والی آیت ''وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة'' (ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ باقی رہے) کے ذیل میں کی ہے۔ مولاناؒ نے منکر کی دو قسمیں: (۱) قلب و ذہن کی گندگی، (۲) فعل و عمل کی برائی بیان کرنے کے بعد کہا ہے:

> منکر کی اس دوسری قسم کو جس کے خلاف اسلام میں قوت استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے پہلی قسم سے ممتاز کرنے اور اس کی نوعیت کو اور زیادہ واضح کر دینے کے لئے اللہ تعالی نے فتنہ اور فساد کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے، چنانچہ ان تمام آیات میں جن میں منکر کے خلاف جنگ کی اجازت دی گئی ہے، یا جنگ کی ضرورت ظاہر فرمائی گئی ہے، یا اسے بزور شمشیر مٹانے کا حکم دیا گیا ہے، آپ کو منکر کے بجائے ہی فتنہ وفساد کے الفاظ ملیں گے'' (الجهاد فى الإسلام، ص ۱۰۴)۔

مگر پھر مولانا نے فتنہ کو اللہ کے دین سے روکنے کے لئے زور، زبردستی اور تعذیب وامتحان کے معنی میں لیتے

ہوئے اس کو تقریباً (Persecution) کے ہم معنی قرار دیا ہے۔ واضح رہے کہ اوپر مولانا کی وہ عبارت آچکی ہے جس میں مولانا نے فتنے کی یہ تشریح کی تھی کہ اس سے مراد ہے ''سوسائٹی کی وہ حالت جس میں بندوں پر بندوں کی خدائی وفرماں روائی قائم ہو، اور جس میں اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے، فتنے کی حالت ہے''۔ گویا مولانا خود تذبذب کے شکار نظر آتے ہیں اور ان کے یہاں اس اصطلاح کی تین مختلف تشریحات ملتی ہیں۔

## فتنہ فعل وعمل کی برائی نہیں ہے

ہم پورے ادب سے عرض کرتے ہیں کہ قتال وجنگ کی علت کے طور پر جن دو مقامات پر قرآن نے ''فتنہ'' کا تذکرہ کیا ہے ان میں یہ ''فعل وعمل کی برائی'' کا مفہوم نہ کسی کوشش سے پیدا کیا جاسکتا ہے نہ آج تک کسی عالم نے پیدا کیا ہے۔ یہ سراسر ایک علمی جدت ہے۔ حقیقۃً یہاں صرف ظلم وجبر اور تعذیب کے ذریعہ لوگوں کو اسلام سے روکنا ہی مراد ہے۔ اور خود مولانا بھی اسی کتاب میں فتنہ کی یہی حقیقت بیان فرماتے ہیں (الجہاد صفحہ ):

اب یہ لاینحل معمہ پھر ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ پہلے تو مولانا نے یہ ارشاد فرمایا کہ فعل وعمل کی برائی وہ منکر ہے جس کو قرآن فتنہ اور فساد کا نام دے کر اس کے خلاف جنگ کا حکم دیتا ہے۔ اور آگے ''فتنہ کی تحقیق'' کے زیر عنوان رقم فرماتے ہیں کہ اس مؤخر الذکر مفہوم میں فتنہ کا لفظ تقریباً انگریزی لفظ (Persecution) کے (۱) ہم معنی ہے۔ ان دونوں باتوں میں کیسے جوڑ پیدا کیا جائے۔ مولانا نے ''فتنہ'' کے جو قرآنی استعمالات نقل کئے ہیں ان میں کہیں بھی فتنہ سے مراد فعل وعمل کی برائی والا منکر نہیں ہے جیسا کہ مولانا نے پہلے دعوی فرمایا تھا۔

## فساد کی تشریح:

البتہ مولانا نے ''فساد'' کی جو تشریح فرمائی ہے اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کی منشا تمام مفسد اخلاق گناہوں کو قرآن میں ''فساد'' کا مصداق قرار دینا ہے، موصوف نے فساد کے علت قتال ہونے پر دو آیتیں پیش فرمائی ہیں:

**(۱) ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الأرض** ۔ اگر اللہ لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا تو زمین میں فساد پیدا ہو جاتا۔

**(۲) من قتل نفساً بغیر نفس أو فساد في الأرض فکانما قتل الناس جمیعاً** ۔ جس نے کسی کو قتل کیا بغیر کسی قتل یا فساد کی سزا کے تو گویا اس نے ساری انسانیت کو قتل کر دیا۔

کسی معمولی سے علم رکھنے والے کے لئے بھی یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ اس میں سے دوسری آیت تو کسی طرح جہاد وقتال سے متعلق ہے ہی نہیں۔ اس کو جو کچھ تعلق ہے وہ حدود وتعزیرات سے ہے۔ مولانا جیسے ذہین شخص نے اس کو

کیسے یہاں ذکر کیا اس پر حیرت ہے۔

جہاں تک پہلی آیت کا تعلق ہے وہ یقیناً جنگوں کا یہ نتیجہ بتا رہی ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ دنیا کو بگاڑ سے بچاتا ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں ورنہ ہم آیات کا سیاق پورا ذکر کرتے کہ یہاں قرآن نبی اسرائیل پر ظلم وستم کرنے والی طاقت کی شکست کا تذکرہ کر رہا ہے، اس کے بعد کہہ رہا ہے کہ اسی طرح جنگوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو ظلم سے باز رکھتا ہے ورنہ دنیا تباہ ہو جائے۔ ذرا سے غور وفکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں فساد سے مراد وقت کے کفار کی وہ ظلم وسرکشی ہے جس کا سامنا بنی اسرائیل کرتے آرہے تھے، اور جس کا تذکرہ بنی اسرائیل کے قائدین کی زبانی ان الفاظ میں کیا ہے کہ ہمارے دشمنوں نے عرصے سے ہم کو اپنے وطن سے نکال دیا ہے، اور ہمارے بچوں (اور عورتوں) کو قیدی بنالیا ہے'' (وقد أخرجنا من ديارنا و أبنائنا) بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس واقعہ کے بیان سے پہلے جو آیات ۲۴۳ تا ۲۴۵) ہیں وہ مسلمانان مدینہ کو مکہ ظالم طاقت کے خلاف جنگ کرنے اور اس کی تیاری کے لئے مال خرچ کرنے کا حکم دینے والی آیات ہیں۔

اس سیاق میں بنی اسرائیل کی اسی حالت مظلومیت کا تذکرہ یقیناً مسلمانوں کو ان کی اپنی حالت یاد دلاتا تھا۔ اس ماحول اور سیاق کو ذہن میں رکھنے کے بعد بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں ''فساد'' سے کیا مراد ہے یقیناً ''فعل وعمل کی برائی'' جس کے دائرے میں مولانا آگے جا کر وہ تمام گناہ داخل بتاتے ہیں جو آدمی کے ذاتی اخلاق کو غارت کرتے ہیں، ہرگز یہاں مراد نہیں ہے۔ جس موقعہ اور زمانے کی یہ آیت ہے، اس میں مسلمانوں کو صرف اور صرف مکہ والوں کی تعدی اور ظلم وجبر سے لڑنے کا حکم دیا جارہا تھا۔

## قرآن نے فساد کے خلاف کہیں قتال کا حکم نہیں دیا ہے:

بلکہ قرآن نے کسی جگہ بھی ''فساد'' کے خلاف جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا ہے، قرآن مجید میں مسلمانوں کو جہاد پر ابھارنے اور جنگ کے لئے جوش اور حمیت پیدا کرنے والی آیات نہایت کثرت کے ساتھ ہیں لیکن کہیں بھی ان کو ''فساد'' کو مٹانے کے لئے جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔

## فساد فی الأرض کے معنی:

ہاں! اللہ تعالیٰ نے یہ ضرور کہا ہے کہ اگر زمین اہل حق کے جہاد سے خالی ہوگی تو ''زمین میں فساد'' رونما ہوگا، ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لفسدت الأرض ''(البقرۃ:) فساد اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے تو بڑا عام لفظ ہے، ہر بگاڑ اور صلاح کی ضد پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے اور مولانا مرحوم نے اس کو اسی معنی میں لیتے ہوئے قرآن کی

بہت سی آیات میں ''فساد'' کے معانی و مصداقات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ ''الاثم'' (یعنی بقول مولانا ذاتی اخلاق بگاڑنے والے گناہ) کو بھی فساد کا مصداق قرار دے دیا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ ہر گناہ بگاڑ ہے، مگر جب فساد کے یہ معنی اس سیاق میں بتلائے جائیں کہ ہر فساد و فتنہ کی خلاف جہاد کا حکم دیا گیا ہے اور ہر اخلاقی خرابی فساد ہے، تو یہ تشریح بڑی محل نظر ہو جاتی ہے اور ''لا إكراه في الدين'' کے قرآنی اصول سے سیدھی جا ٹکراتی ہے۔

قرآن مجید میں فساد اور اس کے مشتقات Derivatives پچاس جگہ پر آئے ہیں، اور نہایت قلیل مواقع کے استثناء کے ساتھ عموماً ہر جگہ اس سے ناجائز خونریزی، بدامنی، حق تلفی اور ظلم و قہر کے معنی ہی مراد ہیں۔ جو حضرات اس کی تفصیل جاننا چاہیں وہ ایسے مواقع کو ان کے سیاق و سباق پر غور کے ساتھ دیکھ لیں، ان شاء اللہ اطمینان حاصل ہو جائے گا۔

مولانا مرحوم نے جو دو آیتیں اپنے خیال کے مطابق اس مقصد سے پیش کی ہیں کہ قتال کی ایک علت ''فساد'' ہے، ان میں ''فساد ارض'' یا فساد فی الأرض کے الفاظ ہیں۔ صرف فساد لغت کے اعتبار سے کسی بھی بگاڑ اور خرابی کے لئے آ سکتا ہے۔ اگرچہ قرآن عموماً فساد کو اور خصوصاً باب افعال کے صیغے ''افساد'' کو خونریزی، ظلم و حق تلفی اور بدامنی کے معنی میں ہی استعمال کرتا ہے۔ مگر ''فساد فی الأرض'' کے بارے میں عربیت کے ذوق اور اس تعبیر کے مواقع استعمال سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ صرف گناہ برائی یا مولانا کے الفاظ میں ذاتی اخلاق کو بگاڑنے والے گناہ ''الاثم'' پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ فساد فی الأرض کے معنی میں لازمی طور پر ظلم و زیادتی، خونریزی، اور طاقت کے زور پر لوگوں کو مقہور و مجبور بنانا ضرور داخل ہے۔ قرآن کے استعمالات پر گہری نظر رکھنے والے مشہور امام عربیت علامہ جار اللہ زمخشری نے اس طرف اشارہ فرماتے ہوئے لکھا ہے:

"والفساد فی الأرض هيج الحروب والفتن" فساد فی الارض کے معنی جنگیں بھڑکانا اور فتنہ (قتل و خونریزی) پھیلانا ہے۔ (تفسیر سورۃ بقرۃ، آیت:۱۱)

بالکل یہی الفاظ ہمیں صاحب مدارک التنزیل علامہ نسفی اور ابو السعود کے یہاں بھی ملتے ہیں۔

## عجیب و غریب طریق استدلال:

یہاں مولانا کے استدلال کا یہ پہلو بڑا محل نظر ہے کہ قرآن نے اگر کسی جماعت کو ایک جگہ مفسد کہہ دیا تو اب پورے قرآن میں اس کے کردار و عمل کی جن خرابیوں کا بھی تذکرہ آیا ہے مولانا کہتے ہیں کہ یہ قرآن کی اصطلاح میں فساد کا مصداق ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی کسی کو کہے کہ وہ نہایت خائن ہے، پھر کسی دن کہے کہ وہ شراب پیتا ہے، اس سے میں یہ نتیجہ اخذ کروں کہ متکلم کے نزدیک شراب پینا خیانت کا مصداق ہے۔ مذکورہ طریقۂ استدلال بعینہ اسی قسم کا ہے۔

## اس سے بھی عجیب بات:

بہر حال مولانا کی اس پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ ''مصلحانہ جنگ'' کا سبب قرآن کے بموجب ''فتنہ اور فساد'' ہیں اور ان دونوں کے دائرے میں مولانا کی تشریح کے مطابق تمام ہی تمدنی اور اخلاقی خرابیاں آجاتی ہیں۔ بحث کے اس نقطہ پر پہنچ کر (جب ایک سادہ ذہن قاری ''فتنہ وفساد'' کو اسلامی نقطۂ نظر سے جنگ کا اصلی سبب جاننے لگتا ہے اور ان کے وہی معانی اس کے ذہن میں بیٹھ جاتے ہیں جو مولانا نے ذکر فرمائے ہیں اور وہ یہ یقین کرنے لگتا ہے کہ ہر طرح کے اخلاقی اور تمدنی فساد کو مٹانے کے لیے اسلام نے جنگ کو فرض کیا ہے) تو اب مولانا یہ فرماتے ہیں کہ نہیں! یہ ''فتنہ وفساد'' بھی جنگ کا سبب نہیں ہے، بلکہ جنگ کا اصل سبب غیر مسلم حکومت ہے، اور وہ اس جواز کی بنیاد پر کہ وہی ان ساری برائیوں کا سرچشمہ یا ان کا محافظ ہوتی ہے۔

بحث کا یہ پہلو چونکہ مولانا کے استدلال کا مرکزی حصہ ہے اس لئے ہم اسے مکمل مولانا کے الفاظ میں نقل کریں گے۔ مگر سردست ذہن میں اٹھنے والے اس سوال کا تذکرہ ضرور کردیں کہ پہلے تو مولانا ''فعل وعمل'' کی برائی ''منکر'' کو فتنہ وفساد کا مصداق قرار دے کر قتال کو ضروری قرار دیتے ہیں، اور مولانا کے یہاں اس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں ''گناہ'' اور الاثم بھی جنگ چھیڑ دیے جانے کے لئے ایک سبب قرار پاتا ہے۔ مگر اچانک یہ کیا ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ مولانا ان جرائم اور گناہوں کو نہیں بلکہ ''غیر مسلم حکومت'' کو قتال کا اصل سبب قرار دینے لگتے ہیں۔ وجہ مولانا ہی کے الفاظ میں پڑھئے:

> ''اب اگر ان تمام برائیوں پر ایک غائر نظر ڈالی جائے جن کو فتنہ وفساد سے تعبیر کیا گیا ہے تو اس سے یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ وہ سب کی سب ایک ناحق شناس، ناخدا ترس، اور بداصل نظام حکومت سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر کسی برائی کی پیدائش میں ایسی حکومت کا براہ راست کوئی اثر نہیں ہوتا تو کم از کم اس کا باقی رہنا اور اصلاح کے اثر سے محفوظ ہونا تو یقیناً اسی حکومت کے باطل پرور اثرات کا رہین منت ہوتا ہے۔ اول تو ایسی حکومت فی نفسہ ایک فتنہ ہے، کیوں کہ وہ حکومت کے منشأ اصلی کے خلاف ہوتی ہے۔ پھر اس کی برائی کسی ایک دائرے تک محدود نہیں رہتی بلکہ تمام برائیوں کا سرچشمہ اور فتنہ وفساد کے تمام اصول فروع کا منبع بن جاتی ہے۔ اسی سے صدعن سبیل اللہ ہوتا ہے، اسی سے حق وانصاف کا سر کچلا جاتا ہے، اسی سے بدکاروں اور ظالموں کو اپنے برے اعمال کی قوت حاصل ہوتی ہے، اسی سے اخلاق کو تباہ کرنے والے اور عدل اجتماعی (Social Justice) کو غارت کرنے والے قوانین نافذ ہوتے

ہیں، وہی بنی آدم کی جمعیت میں نفاق وشقاق کی تخم ریزی کرتی ہے، اسی کی بدولت جنگ وخونریزی کی آگ دنیا میں بھڑکتی ہے، اسی سے قوموں اور ملکوں پر بلائیں نازل ہوتی ہیں اور خلاصۂ کلام یہ کہ یہی وہ چیز جس کی قوت کسی نہ کسی حیثیت سے ہر بدی وبدکاری کا وسیلہ یا اس کے قائم یا باقی رہنے کا ذریعہ بنتی ہے۔(الجہاد صفحہ ۱۱۷)۔

مولانا مودودیؒ کی کتاب اس موضوع پر ایک کارنامہ تھا، اس کی اس تاریخی اہمیت میں کوئی دوسرا شریک نہیں کہ وہ ایسے وقت سامنے آئی جب الزامات کے شور نے کانوں کے پردے پھاڑ دیے تھے۔ پورے ماحول میں ایک طرح کی سراسیمگی طاری تھی، بہت کسی سے بن پڑتا تھا تو وہ نہایت نحیف آواز اور سہمے سہمے انداز میں کچھ معذرت خواہانہ صفائیاں پیش کرلیا کرتا تھا۔ اس ذہین نوجوان نے پورے اعتماد کے ساتھ جہاد کی وکالت کی۔ اور دوسرے مذاہب اور مغرب کے مدعیان تہذیب کے کارناموں کی تصویر سامنے رکھ کر نہ صرف تصور جہاد کی عظمت ظاہر کی بلکہ بہت سوں کو شبہات کے دلدل سے نکال لیا۔

مولاناؒ کی کتاب کی اس افادیت اور اہمیت کے پورے اعتراف کے باوجود ایک غیر جانبدار قاری مولانا کے نظریۂ ''مصلحانہ جنگ'' سے مطمئن نہیں ہوسکتا۔ غیر مسلموں کو تو چھوڑیے، خود مسلمان اہل دین اس نظریہ سے (جو اصطلاحات اور تعبیرات کے فرق کے ساتھ ایک مشہور نظریہ ہے) دلوں میں خلش پاتے ہیں۔ ہمارے برصغیر میں چونکہ مولانا نے ہی اس نظریہ کی جدید تفہیم کی ہے اور اس کے دلائل بڑی تفصیل سے پیش کیے ہیں اس لئے ہم نے ان کا مفصل جائزہ لینا ضروری سمجھا۔

## رسول اللہ کی جنگوں کی نوعیت:

قرآن ہی نہیں رسول اللہ کی سیرت وسنت اور آپ کی دس سال مدنی زندگی کی جنگوں کا حال دیکھ لیجئے آپ نے کسی صلح پر آمادہ طاقت سے جنگ نہیں کی۔ مکہ والوں کے بارے میں قرآن نے بارہا صراحت کی کہ انہوں نے جنگ چھیڑ رکھی ہے ''وھم بدء وکم اول مرۃ'' (انہوں نے ہی جنگ کی ابتداء کی ہے) یہ بھی کہا کہ وہ زیادتی اور ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں ''واولئک ھم المعتدون''۔ تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ مکہ میں مظالم اور مذہبی جبر کے اس دور کے بعد، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو گھربار، مال اور اولاد چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی، وہ مدینہ پر حملے میں بھی ابتدا کر چکے تھے۔ ان کے حملہ آور مدینہ پر شب خون اور لوٹ کی کاروائیاں کرتے رہتے تھے۔ مزید انہوں نے، سنن ابوداؤد (باب فی خبر بنی النضیر) کی صحیح روایت کے مطابق، مدینہ میں یہود کو اور غیر مسلم عربوں کو بھی مسلمانوں سے لڑانے اور ان کے اخراج پر آمادہ کرنے کے لئے دھمکی آمیز خطوط لکھے۔ تیسرا یہ کہ انہوں نے عرب کی زمین مسلمانوں پر

ایسی تنگ کر رکھی تھی کہ غریب مہاجرین تجارت کے لئے، جس کے علاوہ ان کے پاس کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا، مدینہ سے نکل تک نہیں سکتے تھے۔ اس طرح مسلمان ایک طرح کی جیل میں اور معاشی حصار میں زندگی گذارنے پر مجبور تھے۔ (البقرۃ:۲۷۳)۔ اس لئے رسول اللہؐ نے ان کے خلاف جنگی کارروائیاں شروع فرمائیں۔

اس کے باوجود ان سے صلح پر آپ کی آمادگی کا یہ حال تھا کہ آپؐ نے ایک مرتبہ یہ تک فرمایا ''**لا یسألونی خطۃ یعظمون فیہا حرمات اللہ إلا أعطیتہم إیاہا**'' یعنی قریش مجھ سے جو بھی صلح کی شرط رکھیں گے اگر اللہ کی حرمات کا خیال رکھا جائے گا تو میں اسی کو ضرور قبول کرلوں گا (بخاری، باب الشروط فی الجہاد)۔

مدینہ کے یہودی قبائل کو رسول اللہؐ نے اسلامی ریاست کے معزز اور باحیثیت شہریوں کی طرح رکھا۔ ریاست کا جو دستور لکھا گیا اس میں یہود کے قانونی امتیازات حقوق وفرائض کا پورا تذکرہ کیا گیا تھا۔ یہود نے اس کو قبول کر کے اسلامی ریاست اور اس کے حاکم اعلی کی حیثیت سے رسول اللہ کو قبول کیا تھا۔ مگر سب سے پہلے بنی قینقاع نے علانیہ معاہدہ توڑا، بغاوت کی اور جنگ کا اعلان کیا (سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد)۔ پھر بنو نضیر نے غداری کی انتہا یہ کی کہ رسول اللہ کو (معاذ اللہ) دھوکہ سے قتل کرنا چاہا۔ سازش کا انکشاف ہوگیا مگر آپؐ نے بھی تحمل کی انتہا کردی۔ ان کو سزا دینے کے بجائے مہلت دینے کا ارادہ فرمایا اور ان سے کہا کہ اب تم پر اس کے بغیر اطمینان نہیں کیا جاسکتا کہ تم ازسرنو معاہدہ لکھو۔ مگر وہ تو آمادۂ جنگ تھے، معاہدۂ صلح پر آمادہ نہیں ہوئے۔ جب کہ بنی قریظہ نے معاہدہ کی تجدید کی۔ پھر آپ نے ان پر لشکر کشی فرمائی (سنن ابی داؤد، باب خبر بنی النضیر، بسند صحیح)۔ بنی قریظہ کی عہد شکنی بلکہ غزوۂ خندق کے نازک ترین موقع پر حملہ آور فوجوں کا ساتھ دینا اور حملہ میں شرکت معروف ہے۔

دیگر عرب کے مشرک قبائل کے بارے میں قرآن کی صراحت اور تاریخ کی تصدیق ہے کہ وہ سب مسلمانوں کے خلاف آمادۂ پیکار تھے اور قریش کے اتحادی تھے۔ قرآن نے ان کے بارے میں کہا ہے: ''**وقاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ**'' اور تمام مشرکین سے جنگ کرو اس لئے کہ وہ سب کے سب تم سے جنگ کر رہے ہیں۔

نجد کے قبائل عکل وعرینہ اور بنو سلیم کی سنگین غداریاں اور خونچکاں حرکتیں معروف ہیں۔ بنو مصطلق جن پر آپ نے اچانک حملہ کیا تھا، وہ پہلے سے محارب تھے، انہوں نے احد میں اہل مکہ کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کیا تھا۔ پھر ان کے سردار کے بارے میں یہ اطلاع آئی کہ وہ مدینہ پر حملے کے لئے فوجیں جمع کر رہا ہے۔ آپ نے بریرہ بن الحصیب الاسلمیؓ کو تصدیق کے لئے بھیجا، وہ خود سردار قبیلہ حارث ابن ابی ضرار سے ملے اور اسی سے تیاریوں کی تصدیق کرلی، جب تحقیق ہوگئی تو آپ نے حملہ فرمایا، (طبقات بن سعد، ۶۳/۲، وسیرت ابن ہشام)۔

شمال عرب کی مہمات کی تفصیل پیچھے غزوۂ تبوک اور غزوہ موتہ کے حوالے سے گذر چکی ہے، ہم نے ان مہمات کا پورا تاریخی پس منظر ذکر کر دیا ہے۔ اس سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے ان طاقتوں کے خلاف جو جنگ کی تھی وہ ان کے محاربہ کے نتیجہ میں تھی، آپ نے کسی صلح جو اور امن پر آمادہ طاقت کے خلاف قطعاً جنگ نہیں کی۔

## ابن تیمیہ اور ابن قیم کی صراحتیں:

امام ابن تیمیہ اپنے رسالہ قاعدۃ فی قتال الکفار میں کہتے ہیں:

**وکانت سیرته (صلی الله علیه وسلم) ان کل من هادنه من الکفار لا یقاتله، وهذه کتب السیرة والحدیث والتفسیر والفقه والمغازی تنطق بهذا وهو متواتر من سیرته.**

آپ کی سیرت کی شہادت ہے کہ آپ سے جن کفار نے صلح کی آپ ان سے جنگ نہیں کرتے تھے، یہ سیرت کی کتابیں ہیں، یہ حدیث وتفسیر اور فقہ وتاریخ کی کتابیں ہیں، سب یہی بتلاتی ہیں۔ اور یہ چیز آپ کی سیرت سے متواتر اور قطعی طور پر ثابت ہے (کتاب مذکور صفحہ:۱۳۴)۔

علامہ ابن قیمؒ اپنی کتاب ''ہدایۃ الحیاریٰ'' میں کہتے ہیں:

**من تأمل سیرة النبی (صلی الله علیه وسلم) تبین له ......أنه انما قاتل من قاتله وأما من هادنه فلم یقاتله۔**

جو رسول اللہ کی سیرت میں غور کرے گا اس کو پتہ چل جائے گا کہ...... آپ نے صرف ان لوگوں سے جنگ کی جو آپ سے جنگ کرتے تھے، رہے وہ جنہوں نے آپ سے صلح کی آپ نے ان سے جنگ نہیں کی۔ (جلد اول، صفحہ:۱۱۲)۔

## عہد نبوی کی جنگوں کے لئے صحیح تعبیر:

عہد نبوی کی جنگوں کو جن بزرگوں نے ''دفاعی'' جنگوں کا نام دیا ہے، غالباً یہ لفظ اس لئے صحیح نہیں کہ اس سے یہ خیال قائم ہوتا ہے کہ آپ نے دوسروں کے حملوں کا صرف دفاع کیا۔ حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ آپ محاربہ کا ارادہ اور تیاری کرنے والوں کے خلاف خود بھی اقدامات فرمایا کرتے تھے۔ جنگ بدر ایسے ہی ایک اقدام کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہوئی۔ موتہ اور تبوک کی یہی کہانی ہے۔ اور بنو مصطلق اور دیگر کئی مہموں کی یہی حقیقت ہے۔ آج کی اصطلاح میں آپ ان جنگوں کو (Preemptive wars) کہہ سکتے ہیں۔ بہر حال آپؐ نے دفاعی جنگیں بھی لڑیں ہیں اور محاربہ

کرنے والوں کے خلاف اقدامی جنگیں بھی۔ مگر آپ کی ہر جنگ صرف محارِب طاقتوں کے خلاف تھی۔ اور اسی لئے قطعی طور پر منصفانہ تھی اور اس ''اعتداء'' اور زیادتی سے پاک تھی جس سے دور رہنے کا حکم قرآن نے مسلمانوں کو عین اس وقت دیا تھا جب ان پر جنگ کرنا واجب قرار دیا جا رہا تھا۔ **وقاتلوا فی سبیل الله الذین یقاتلونکم و لا تعتدوا إن الله لا یحب المعتدین.**

## علت القتال محاربہ ہے:

اسی لیے راقم سطور کی رائے میں جہاد کو صرف دفاع کی حد تک محدود کہنا صحیح نہیں ہے۔ جہاد اقدامی بھی ہے اور دفاعی بھی۔ اس لیے کہ دفاع کے لفظ سے یہ مترشح اور محسوس ہوتا ہے کہ حملے میں پہل ناجائز ہوگی۔ حالانکہ ظلم اور ''فتنہ'' کی مرتکب طاقت کے خلاف قرآن نے جنگ کی ابتدا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور رسول اللہؐ اور صحابہؓ کرام نے ایسا کیا ہے۔ نیز ایک اہم بات یہ ہے کہ کسی طاقت نے اگر جنگ کی ابتدا نہیں کی ہے لیکن وہ صلح پر اور اسلام کی دعوت کے امکانات کھولنے پر راضی نہ ہو اور اس کی طرف سے حملے کا خدشہ قائم ہو تو اس پر پیش قدمی کر کے حملہ اگر چہ دفاع نہیں کہا جا سکتا لیکن مسلّم عرف انسانی میں یقیناً وہ ایک جائز حملہ ہوگا۔ اور رسول اللہؐ نے ایسی متعدد جنگیں کی ہیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ جب کسی طاقت سے جنگ چھڑ جائے، اور دشمن کسی بامعنیٰ صلح پر راضی نہ ہو، لیکن دونوں فریق بغیر کسی معاہدے کے عملاً قتال اور لڑائی روک کر اپنے مورچوں میں واپس چلے گئے ہوں، پھر ایک فریق حملے میں ابتدا کر دے تو یہ، دفاعی جنگ نہ ہونے کے باوجود، اس پہلے سے چلی آ رہی جنگ کا تسلسل ہونے کی وجہ سے جائز اور معقول جنگ ہوگی۔ اس میں آپ حملہ آور فریق کو ظالم نہیں کہہ سکتے۔ رسول اللہؐ نے قریش کے تجارتی قافلوں پر جو حملے کیے، جن میں وہ مشہور حملہ بھی تھا جس کے بعد غزوۂ بدر پیش آیا، وہ اسی نوعیت کے معرکے تھے۔ اس کے علاوہ متعدد جہادی مہمات یہی نوعیت رکھتی تھیں۔

## قرون اولیٰ کی جنگی مہمات:

صحابہ کرام اور خلافت راشدہ کے دور میں فارس و روم کی مقبوضات فتح کی گئیں، اس دور میں ہم کو ان دونوں سلطنتوں کے خلاف ایران کی سرحدوں سے لے کر شام و مصر اور الجزائر تک جنگوں کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے۔ جلد بازی اور سرسری نظر سے مطالعہ کرنے والے ان جنگوں کی علت یہ بتاتے ہیں کہ صحابۂ کرام نے جب عرب کے دائیں بائیں نظر اٹھائی کفار کو حکمراں دیکھا۔ تو ان کو اپنے دین کا یہی حکم نظر آیا کہ ان کے سروں پر تلوار لے کر پہنچ جائیں اور صاف کہہ دیں یا اسلام قبول کر و یا مسلمانوں کے لیے تخت چھوڑ دو۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگیں دراصل عہد نبوی کی جنگوں کا امتداد ہیں، رسول اللہ کی جب وفات ہوئی تو شام کے حدود پر رومن امپائر کے ساتھ جنگ شروع ہو چکی تھی، اور متعدد معرکے ہو چکے تھے۔ قیصر اور اس کی ماتحت طاقتیں اپنے پڑوس میں ایک انقلابی اور نہایت جاذب و مؤثر دعوت پر قائم ریاست کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے لاکھوں کے لشکر جمع کر چکیں تھیں۔ اور رسول اللہ نے ان کی پیش بندی کے لئے اقدامات بھی فرمائے تھے۔ لیکن نہ رومیوں کا زور ٹوٹا تھا نہ ان کے ارادے بدلے تھے۔ لہذا بعد میں بھی اس قسم کے اقدامات کرنے ضروری تھے، تا کہ اس خطرے کا سد باب ہو سکے، یہ کام خلافت راشدہ کے دور میں انجام پایا۔

سلطنت فارس دوسری بڑی طاقت تھی، جو صحابہ کرام کے ہاتھوں زیر ہوئی۔ رسول اللہ نے اس کے فرماں روا کسریٰ کو دعوت اسلام کا خط لکھا، جو اس نے نہ صرف نہایت رعونت کے ساتھ پھاڑ ڈالا، بلکہ اپنے ایک گورنر کو (معاذ اللہ) رسول اللہ کو گرفتار کر کے اپنے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا۔ یمن کے گورنر نے دو سپاہیوں کو رسول اللہؐ کے لیے اس پیغام کے ساتھ مدینہ بھیجا کہ اپنی اور عرب کی خیر چاہتے ہو تو گرفتاری قبول کر کے کسریٰ کے دربار میں حاضر ہو جاؤ۔ ورنہ تم کسریٰ کی طاقت و جبروت کو جانتے ہو، وہ تمہارے پورے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔

بہر حال اس پس منظر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ تصور سراسر سطحی مطالعہ پر مبنی ہے کہ خلافت راشدہ کے دور میں جو جنگیں ان ممالک کے ساتھ ہوئیں قصہ کی ابتداء وہیں سے ہوتی ہے۔ نہ ان کے ساتھ کوئی کشمکش جاری تھی اور نہ یہ حکومتیں اس کے علاوہ کسی اور جرم کی مرتکب تھیں کہ وہ غیر مسلم تھیں اور صاحب شوکت تھیں۔ افسوس! کس قدر سادگی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ لوگ جو خلافت راشدہ کی ان جنگوں کے پورے تاریخی پس منظر کے ریکارڈ ہونے کے باوجود ان ظالم و خونی حکومتوں کو اور ان کے دشمنِ حق حکمرانوں کے خلاف جنگ کا سبب صرف غیر مسلم حکومت کا خاتمہ قرار دیتے ہیں؟؟ کوئی شخص جو ایک طرف ان سلطنتوں کی توسیع پسندی کی ہوس اور خونی تاریخ کو جانتا ہو اور دوسری طرف وہ نوخیز اسلامی ریاست اور ان طاقتوں کے ابتدائی تعلقات کے اس پس منظر پر بھی نظر رکھتا ہو جس کو ہم نے اوپر ذکر کیا، کیا وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے بالکل پڑوس میں واقع ان عالمگیر طاقتوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا؟؟ اگر شدید خطرہ تھا، اور یقیناً تھا، تو ان جنگوں کا حقیقی سبب اس سنگین خطرے کی پیش بندی اور اسلامی ریاست کا تحفظ تھا۔

ان دونوں حکومتوں سے جنگ کو مسلمانوں پر فرض کرنے والی ایک دوسری اہم چیز یہ بھی تھی کہ ان طاقتور حکومتوں کے باقی رہتے ان کے عوام تک اسلام کی دعوت پہنچنے کا قطعاً کوئی امکان نہیں تھا۔ اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اسلام کے اولین داعیوں کا کیا انجام رومن امپائر کی تابع ایک عرب ریاست میں ذات اطلاح کے مقام پر ہوا۔ دعوت

اسلام دیتے ہی پندرہ میں سے چودہ داعیوں کو قتل کر دیا گیا، صرف ایک نہایت زخمی حالت میں ......مدینہ پہنچ سکا۔ ان ریاستوں کے ایک معزز امیر نے اسلام قبول کر لیا تو ہرقل (بیزنطینی رومن سلطنت کے فرمانروا) نے اس کو بلا کر سولی پر لٹکا دیا کہ دوسروں کے لئے عبرت کا سامان بنے۔

نامۂ نبوی پر کسریٰ کے رعونت بھرے ردعمل نے صاف بتا دیا تھا فارسی علاقوں میں دعوت اسلام کا نام بھی نہیں لیا جا سکتا۔ ان حکومتوں کے مذہبی جبر، اور قرآنی اصطلاح میں ''فتنہ'' اور ''صدعن سبیل اللہ'' نے یقیناً ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی کہ اللہ کے سپاہی اٹھیں اور ان کے غرور کو، بحکم خدا، خاک میں ملا دیں۔

ان حکومتوں کا یہی جرم دراصل صحابۂ کرام کی جنگوں کا اصل سبب تھا۔ دراصل اس زمانہ کی صورت حال ہی ایسی تھی کہ کوئی حکومت اپنی قلمرو میں دوسرے دین کو اور خصوصاً اسلام جیسی دعوت کو ہرگز نہیں پنپنے دے سکتی تھی، یہ چیز اس زمانے کی صورت حال میں بالکل قطعی اور طے تھی، اسی لئے رسول اللہؐ نے ان حکمرانوں کو جو خطوط لکھے تھے ان میں کہا تھا کہ اگر تم اسلام نہیں لائے تو پوری قوم کے کفر کے تم ہی ذمہ دار ہو گے۔ آپؐ نے کسریٰ کو لکھا: فان ابیت فعلیک إثم المجوس ''(تاریخ طبری:۱۲۳/۲) مقوقس شاہ مصر کو آپ نے لکھا: ''فان ابیت فان إثم القبط علیک ''(زادالمعاد:۶۰۰/۳) قیصر کو آپ نے لکھا: ''فعلیک إثم الیریسین'' (صحیح بخاری) ریسین یا اُرِیسین سے مراد کاشتکاروں پر مشتمل وہ کثیر تعداد کی رعایا تھی جو رومی مقبوضات (شام و مصر اور افریقہ وایشیا) کے وسیع علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی، اور جن کی حیثیت تاریخ کی واضح شہادتوں کی روشنی میں مقہور و مجبور غلاموں کی سی تھی۔

## ایک اور استدلال:

جو حضرات بوقت قدرت تمام غیر مسلم حکومتوں سے، چاہے وہ صلح کرنے پر آمادہ ہی کیوں نہ ہوں، جنگ کے فرض ہونے کی رائے رکھتے ہیں ان میں سے بعض بزرگ اسی استدلال کے لیے جو مولانا مودودی کے حوالے سے اوپر گذرا ہے ایک نسبۃً زیادہ معقول تعبیر اختیار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ غیر مسلم حکومت جب اپنی حربی طاقت، مادی وسائل اور اپنے نظریات کے ساتھ موجود رہے گی تو اس کی یہ شوکت خود اس کے عوام کے لئے اسلامی دعوت قبول کرنے سے ایک نفسیاتی رکاوٹ پیدا کرے گی، کفر کی ایسی شوکت وعزت کے ساتھ لوگ آزادانہ غور وفکر نہیں کر سکیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی قوم کی شوکت وطاقت اس کے نظریہ کے لئے ایک مددگار وسازگار ماحول پیدا کرتی ہے، اور اس ماحول میں کسی دوسری اجنبی دعوت کے لئے ایک درجہ کی نفسیاتی رکاوٹ پیدا ہونا یقیناً فطری امر ہے۔ مگر مجھے یہ بتائیے کہ کیا اگر کوئی دوسری قوم یہ کہے کہ ہمارے نظریات پر مسلمان غیر جانبداری کے ساتھ اس وقت تک غور

کر ہی نہیں کر سکتے جب تک مسلمانوں کی حکومت وشوکت ختم نہیں کی جائے، لہٰذا ہم مسلمانوں کے ملک پر اس لیے حملہ کر رہے ہیں تا کہ وہ آزادانہ ہماری دعوت پر غور کر سکیں، تو ایسی شکل میں ہم کیا کہیں گے؟؟

اگر ہم مذہب وعقیدہ اور نظریہ کے سلسلہ میں آزادانہ انتخاب کے اصول کے قائل ہیں تو آزادی کے لئے ساری ملتوں کے حق میں ایک ہی معیار اپنانے کا پابند ہونا ضروری ہے۔

نیز یہ بھی سوچئے کہ دنیا میں کون انصاف پسند اس قوم وملت کے بارے میں اچھی رائے رکھ سکے گا جو یہ کہے کہ چوں کہ ہم کو اپنے دین کی تمہیں دعوت دینی ہے اور تمہاری حکومت اور طاقت ایسی نفسیاتی رکاوٹ بن رہی ہے جس کے رہتے ہوئے تمہارے لئے ہماری دعوت پر پورے طور پر غیر جانبدار ہو کر غور کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے ہم تم سے جنگ کر کے پہلے اپنی حکومت تم پر قائم کریں گے اور تمہاری طاقت ختم کریں گے۔ ہم بصد ادب و نیاز اپنے بزرگوں سے گذارش کریں گے کہ یہ منطق اسلام کی دعوت کے سامنے کسی بھی غیر مسلم حکومت سے بڑی نفسیاتی رکاوٹ بنے گی۔ اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں یہی تاثر قائم کرے گی کہ یہ باتیں سب بہانے اور دھوکے ہیں، اور ان کی آڑ میں ہم کو غلام بنانے اور دباؤ اور لالچ کے ذریعہ ہمارا دین بدلنے کا منصوبہ ہے۔

## اصل بات کیا ہے؟

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علماء سلف کی اکثریت کی تحریروں اور تشریحات سے غالب تاثر یہ نہیں قائم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت اور غیر مسلم حکومت کے درمیان اصل صلح ہے، اور صلح پر آمادہ قوم کے خلاف جنگ کی گنجائش نہیں ہے۔ ماضی کی طویل تاریخ پر محیط اسلامی فکر کا عمومی رجحان اسی طرف محسوس ہوتا ہے کہ اگر مسلمانوں کے پاس قدرت وطاقت ہو تو وہ کسی غیر مسلم طاقت سے صلح نہیں کریں گے، چاہے وہ کسی ''فتنہ'' یا زیادتی کی مرتکب نہ ہو، اور صلح کی پیش کش بھی کرے۔

پھر کیا یہ رائے غلط تھی؟ کیا علمائے سلف اور ائمہ اسلام اتنی لمبی مدت تک ایک غلط بات کہتے آئے؟ ہر گز نہیں۔ اسلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ قیامت تک مکمل محفوظ رہے گا۔ اور یہ بھی کہ اس امت کے اہل علم اجتماعی طور پر کسی غلطی میں نہیں پڑیں گے، جو لوگ اپنے علم وفہم کی بنیاد پر اسلاف امت اور ائمہ کرام کے مجموعی موقف کو غلط سمجھتے ہیں وہ بے شمار گمراہیوں کے دروازے کھولتے ہیں۔

ہمیں پورا اطمینان ہے کہ جس دور میں اور جن حالات میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی وہ بالکل برحق رائے تھی، ان حالات کے لئے وہی شرعی حکم تھا۔ پہلے کے زمانوں میں ہر ریاست واضح مذہبی شناخت رکھتی تھی۔ بادشاہتیں

مذہب سے اپنی حکومت کے استحکام کا کام لیتی تھیں۔ بادشاہ یا تو خدا کا اوتار بنتا تھا یا مذہبی قیادت کے ساتھ اس کا یہ سمجھوتہ ہوتا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہیں گے۔ اس لئے اس کا نہ کوئی امکان ہوتا تھا اور نہ ہی تصور کہ کوئی طاقتور حکومت اور منظم ریاست اپنے قلم رو میں اسلام کی نشر و اشاعت و دعوت اور اللہ کی عبادت و بندگی کی اجازت دے سکتی ہے۔

اسی لیے مسلمانوں نے جن ریاستوں سے جنگ کی ان میں سے کسی نے کبھی اس کا جھوٹا دم بھی نہیں بھرا تھا کہ وہ اسلامی دعوت کے لئے راستہ کھولنے کو تیار ہے۔

رسول اللہؐ نے سلاطین عالم کو خطوط لکھے تو ان میں صاف لکھا کہ اگر تمہاری حکومت اسلام قبول نہیں کرتی تو عوام کی گمراہی کا گناہ بھی تم پر ہی ہوگا۔ یہ اسی صورت حال کی طرف اشارہ تھا۔ اس صورت حال میں چاہے وہ ماضی میں ہو یا حال میں یا مستقبل میں شرعی حکم یہی ہوگا کہ قدرت ہو تو ضرور جنگ کی جائے۔ اور اللہ کے دین کے سامنے سے رکاوٹیں ہٹادی جائیں۔

واضح رہے کہ ہماری اس بات کا تعلق محض اس مفروضے سے ہے کہ کوئی حکومت عملاً دعوت اسلام کے سامنے رکاوٹ نہیں بن رہی ہو اور صلح پر آمادہ ہو۔ بہت سے معاصر علماء واہل دانش کی طرح ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ اس زمانے میں کہیں ''فتنہ'' باقی نہیں ہے۔ دعوت اسلام کے سامنے سارے راستے پوری ایمان داری کے ساتھ کھول دیے گئے ہیں، موجودہ زمانہ عیاری اور دجل کے اماموں کا ہے، اس لیے بالکل ممکن ہے کہ کسی حکومت کو جب اسلام کی دعوت اپنے نظام سیاست اور مفادات کے سامنے رکاوٹ یا خطرہ بنتی نظر آئے تو وہ اس سے علانیہ جنگ کرے، اور اس کا منہ بند کرنے اور اس کے حاملین پر ظلم کرنے کے لیے جھوٹے بہانے گھڑے۔ لیکن اگر دنیا کی کوئی حکومت عملاً دعوت اسلام کے سامنے رکاوٹ نہیں بن رہی ہو اور صلح پر آمادہ ہو تو یقیناً اس سے جنگ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ واقعہ میں کون سی حکومت کس کے لیے کیسی ہے ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ رہے۔ لیکن اس زمانے میں نظریاتی سطح پر ضرور یہ سوال ہم سے کیا جارہا ہے اور خود مسلمانوں کے ذہنوں میں آرہا ہے کہ کیا مسلمانوں کو ان کے دین کا حکم یہ ہے کہ اگر ان کے بس میں ہو تو وہ دنیا کی ساری قوموں سے جنگ کریں اور ان کے اوپر مسلمانوں کی حکومت قائم کریں؟؟ ہم بس یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسلام صلح چاہنے والی اور اسلامی دعوت کا راستہ نہ روکنے والی حکومت سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

## جاہلانہ غلو کی ایک مثال:

ہمارے یہاں دینی حمیت کے نام پر کس قدر جہالت آمیز غلو کے شکار ''اہل علم وقلم'' پائے جاتے ہیں اس کی

ایک مثال اس وقت میرے سامنے ہے۔ سرٹی، ڈبلیو، آرنلڈ سے برصغیر کے اہل دانش ناواقف نہیں۔ جب دنیا اسلام کے تلوار کے زور پر پھیلنے کے پروپیگنڈے سے گونج رہی تھی، شور تھا کہ مسلمانوں نے تلوار کی دھار پر قوموں کو زبردستی مسلمان بنایا ہے، اور یہ سب اس لئے تھا کہ استعماری طاقتوں اور عیسائی مشنریز کے لئے عجم کی مسلم اقوام کو اسلام سے برگشتہ کرنا اور ان میں قومی عصبیتوں کو افروختہ کرنا آسان ہو جائے، اس وقت اس غیر مسلم حق گو کی آواز اٹھی کہ: سب جھوٹ ہے۔ ایک شاندار کتاب The preaching of Islam کے نام سے ایسی شائع کی کہ اس کی افادیت آج بھی مسلّم ہے۔ ایسے منصف مزاج اور مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت ہونے والے غیر مسلم دانشور کے بارے میں ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ان جیسوں کو تہ تیغ کر دینا چاہئے۔ لاحول ولاقوۃ إلا باللہ۔

ہم آپ مزید شرمندہ و حیران اور مضطرب ہوں گے جب آپ ان صاحب کو دیا گیا علمی مرتبہ جانیں گے۔ قصہ یہ ہے کہ آرنلڈ کی کتاب کا دنیا کی مختلف اسلامی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا، عربی کے مترجم نے مصنف کے تعارف میں یہ لکھ دیا کہ "حق یہ ہے کہ ہم مصنف کی قدر نہیں کر سکتے"۔ بس کیا تھا ایک برخود غلط نادان "دکتور" نے تبصرہ فرمایا:

> اس کی قدر؟ اس کی قدر یہ ہے کہ تلوار سے سر قلم کر دیا جائے، الا یہ کہ وہ اسلام کے سامنے سر جھکا دے یا جزیہ دے۔
>
> **"قلت ان قدره لو يعلم هؤلاء هو الضرب بالسيف حتى يبرد، او يخضع للإسلام أو يدفع الجزية"**
>
> (أهمية الجهاد للعلياني، صفحہ: ۲۶۲، بحوالہ فقہ الجہاد، شیخ یوسف القرضاوی: ۱/۲۵۳)

معاف کیجئے گا جو شرمندگی ہو کہ ہمارے درمیان دین و شریعت میں اسی قدر کج فہمی کے شکار بھی پائے جاتے ہیں۔ یہی نہیں، حیرانی و شرمندگی کی انتہا نہیں رہتی جب معلوم ہوتا ہے کہ موصوف اس تحریر پر جامعہ ام القریٰ، سعودی عرب سے ڈاکٹریٹ کی سند پاتے ہیں اور ان کو ممتاز کا گریڈ دیا جاتا ہے۔

کیسے عرض کیا جائے کہ سعودی عرب میں علم دین کے ساتھ کیسا مذاق ہو رہا ہے!!

اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے غیر مسلموں کے لئے یہ خیالات رکھنے والے نہ قرآن کو سمجھتے ہیں نہ حدیث کو۔ کاش ان کی نظر جاتی کہ بدر کے قیدیوں کو دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کو ایک پرانا غیر مسلم محسن مطعم بن عدی یاد آتا ہے، جس نے آپ کو طائف سے واپسی پر پناہ دی تھی، آپ ﷺ فرماتے ہیں: اگر مطعم حیات ہوتے اور ان کو چھوڑنے کی سفارش کرتے تو میں ان کی خاطر ان سب کو چھوڑ دیتا۔ (بخاری)۔

اس ذہنیت کے لوگوں کی نفسیات کا یہ محض ایک نمونہ ہے۔ اس کو ایک دو افراد کا مسئلہ سمجھنے کی غلطی نہیں کرنی

ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی *

# قرآن اور محمدؐ کے بارے میں مستشرقین کی ہرزہ سرائیاں

قرآن کریم کے معجزانہ الفاظ جیسے ہی کفار ومشرکین کے کانوں تک پہنچے، حیران و پریشان ہوگئے اور کہنے لگے کہ اس کلام نے تو ہماری زبان دانی کو بے اثر کر کے رکھ دیا ہے۔ چوں کہ ان کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے انکار تھا، اس لیے سوچ سمجھ کر طے کیا کہ اگر تعلیمات نبویؐ کی مخالفت نہ کی گئی اور ان میں عیوب نہ نکالے گئے تو اس کی سحر انگیزی سے پورا مکہ مسحور ہو کر حلقہ اسلام میں داخل ہو جائے گا۔ چنانچہ ان لوگوں نے کلام ربانی اور آپ کی تعلیمات کی قدر و قیمت اور معنویت کو گھٹانے کے لیے متعدد قسم کے اعتراضات کیے۔ مجموعی طور پر ان کے نزدیک قرآن سب کچھ ہو سکتا تھا، مگر اللہ کا کلام نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی نہج کو اختیار کرتے ہوئے بعد کے عہد میں عیسائیوں اور یہودیوں نے دانستہ طور پر محض تعصب کی بنا پر قرآن کریم پر بہتیرے اعتراضات کیے ہیں۔ مگر جب ان کے اعتراض میں کوئی جان نہ رہی تو پھر ان کی ہرزہ سرائی کا رخ بدل گیا اور تعلیمات قرآنی کو خرافات کا مجموعہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ چنانچہ مستشرق 'ویلز' نے یہ پروپیگنڈا کیا: ''مقدس اشخاص کی صف میں شامل ہونے کے لیے محمد کو ادھیڑ عمر میں ان کے حوصلہ مندانہ جذبات نے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھنے پر آمادہ کیا۔ اسی مقصد کے پیش نظر انہوں نے ''خرافاتی عقائد'' اور سطحی ''رسوم وروایات'' کا ایک مجموعہ تیار کیا۔ اپنی قوم میں اس مجموعہ کی اشاعت کی اور کچھ لوگوں نے اس کی پیروی بھی کی۔''[۱] فرانسیسی مستشرق 'بلاشر' نے یہ باور کرانے کی کوشش کی: ''قرآن کے بیان کردہ واقعات اور یہودی و مسیحی حکایات میں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ ابتدائی مکی سورتوں میں مسیحی اثرات بہت زیادہ نمایاں ہیں اور انجیل کے غیر تسلیم شدہ نسخوں خصوصاً کتاب پیدائش جو اس زمانے میں عام تھی اور قرآن کے بیان کردہ واقعات میں مشابہت موجود ہے۔ بانی اسلام اور مسیحی راہبوں کے درمیان مکہ میں تعلقات استوار تھے۔''[۲] فلپ ارلنگی' متضاد آرا کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے: 'محمد کی مکہ میں اکثر یہودیوں سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ محمد اپنے خادم زید سے جو عیسائیوں کا غلام رہ چکا تھا، یہودی اور مسیحی مذاہب کے بارے میں استفسار کی غرض سے سوالات کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے خادم سے زیادہ سمجھ دار تھے۔ مدینہ میں محمد یہودیوں کے شاگرد رہے۔ یہودیوں ہی نے یہ شخصیت تیار کی تھی۔ یہودیوں اور مسیحیوا

* شعبہ دینیات (سنی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یوپی)